Fikr-o-Nasar (Islamabad) 31:4 (1994)

اجتہاد اور بعض اسالیب اجتہاد پر ایک نظر

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

فقہ کا اولین اور بنیادی مأخذ تو صرف وحی الٰہی ہے جو ملت اسلامیہ کی جملہ اجتماعی، معاشی، معاشرتی، قانونی، اخلاقی اور روحانی امور میں آخری اور مطلق سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں وحی کی دونوں قسمیں شامل ہیں وحی متلو یعنی قرآن حکیم اور وحی غیر متلو یعنی سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ فقہی ادب میں وحی کے علاوہ پائے جانے والے باقی تمام مباحث دلائل یا اسالیب ہیں مأخذ و مصدر نہیں ہیں۔ بعض فقہاء بھی انہیں اُدلہ فقہیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا اصل مقصد وحی کے مفہوم کو سمجھنا، زیر غور مسئلہ یا واقعہ کا وحی کی روشنی میں حل تلاش کرنا اور اجتماعی قواعد و ضوابط کو حتی المقدور وحی کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے۔

عہد رسالت میں لوگوں کی دینی و اجتماعی امور میں عمومی رہنمائی وحی کے ذریعہ ہوتی تھی لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض انتظامی امور یا اجتماعی معاملات میں فوری فیصلہ کی ضرورت محسوس ہوئی جس کیلئے آپ نے نزول وحی کا انتظار نہیں کیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود غور و فکر یا مشاورت کے ذریعہ فیصلہ صادر فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ خود فیصلے فرمائے بلکہ اپنے ان صحابہ کرام کو بھی جنہیں آپ نے انتظامی ذمہ داریاں سونپی تھیں اس بات پر مامور فرمایا تھا کہ جب کسی مسئلہ میں وحی خاموش ہو تو اس معاملہ میں خوب غور و فکر کریں اور اپنی رائے اور عقل و بصیرت سے کام لیکر اس معاملہ کو حل کریں۔ ایک فقیہہ جب مخلصانہ طور پر اپنی تمامتر صلاحتیں کسی مسئلہ میں غور و فکر کرنے میں صرف کر دیتا ہے اور وحی کے طے کردہ اصولوں کی روشنی میں کسی نتیجہ تک پہنچتا ہے یا مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے تو اصطلاح فقہ میں یہ عمل اجتہاد کہلاتا ہے۔

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

فقہاء کے نزدیک ایک مجتہد کا اپنی تمامتر صلاحیتوں کو شریعت کا منشاء جاننے میں صرف کر دینے کا نام اجتہاد ہے (۱)

اجتہاد کے ثبوت میں سب سے زیادہ' تسلسل کے ساتھ حدیث معاذ بن جبلؓ کا حوالہ ملتا ہے۔ اصول فقہ پر لکھنے والے متقدمین اور متاخرین تقریباً سب ہی اس حدیث کو ذکر کرتے ہیں۔ اس حدیث کے چند پہلو غور طلب ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ اجتہاد کی اجازت مدنی دور کے اخیر میں دی گئی اور صرف ان لوگوں کو دی گئی جنکی تعلیم و تربیت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے اسلامی عقائد ان کے دل و دماغ میں پوری طرح راسخ ہو چکے تھے' عملی زندگی میں اسلام کا رنگ غالب تھا اور اخلاقی اقدار خوب اجاگر ہو چکی تھیں۔ ایسے افراد کی عقل و بصیرت دین کا فہم رکھتی ہے لہٰذا ان کی فکر اور ان کا عقلی استنباط شرعاً معتبر ہے (۲)

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب حضرت معاذ بن جبلؓ نے یہ فرمایا کہ "اجتہد برائی ولا آلو" "میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی کا اظہار فرمایا اور اجتہاد بالرأی کو قبول فرماتے ہوئے اللہ تعالی کا شکر بجا لائے کہ اس نے نمائندہ رسول کو صحیح سمت میں غور و فکر کی توفیق عطا فرمائی۔

اس حدیث کو ابو داؤد' ترمذی' نسائی' دارمی' ابن ماجہ اور امام احمد بن حنبلؒ نے روایت کیا ہے۔ ان محدثین میں سے امام ترمذی اور الدارمی نے "اجتہد برائی' روایت کیا ہے اور بقیہ حضرات نے "اجتہد رائی" نقل کیا ہے۔ امام ابو داود نے اپنی السنن میں اس حدیث کا جو باب قائم کیا ہے اس کا عنوان یہ ہے "باب اجتہاد الرای فی القضاء" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کبار محدثین کے نزدیک یہ بات طے شدہ تھی کہ قاضی کو معاملات کا فیصلہ کرنے میں عقل و رائے سے بھی کام لینا چاہئے۔ اس حدیث کی مزید وضاحت حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمائی ہے:

"من عرض له منكم قضاء بعد اليوم فليقض بما فى كتاب الله' فان جاء امر ليس فى كتاب الله فليقض بما قضى به نبيه' فإن جاء أمر ليس فى كتاب الله ولا قضى به نبيه ولا قضى به الصالحون فليجتهد رايه ولا يقول انى اخاف و انى اخاف' فان

الحلال بین والحرام بین وبین ذالک امور مشتبہات' فدع ما یریبک الی ما لا یریبک' قال ابو عبدالرحمن ھذا الحدیث جید جداً۔ (۳)

"آج کے بعد جو بھی عہدہ قضاء پر فائز ہو تو اسے چاہیے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے' اگر ایسا معاملہ پیش آئے جس کے بارے میں کتاب اللہ میں کچھ نہ ملے تو پھر سنت رسول کے مطابق فیصلہ کرے' اور اگر ایسا مسئلہ پیش آ جائے جس کے بارے میں سنت میں بھی کچھ نہ ملے تو پھر صلحاء امت کے فیصلوں کو دیکھے' اس میں اگر رہنمائی ہوتی ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کرے' ہاں اگر یہ سب زیر غور مسئلہ کے بارے میں خاموش ہوں تو پھر اپنی رائے سے اجتہاد کرے' اور یہ کہہ کر خاموش نہ رہے کہ میں ڈرتا ہوں' مجھے خوف آتا ہے۔ اس لئے کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ ان کے درمیان مشتبہ امور ہیں' لہٰذا جو چیز تمہارے دل میں کھٹکے اسے چھوڑ کر وہ اختیار کرو جس پر دل مطمئن ہو' ابو عبدالرحمن کا کہنا ہے کہ یہ حدیث بہت اعلیٰ درجہ کی ہے"

اس روایت سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عبداللہ بن مسعود ججوں کو اجتہاد بالرائی پر آمادہ کیا کرتے تھے اور اس معاملہ میں جھجکنے اور بلاوجہ خوف کھانے سے منع کرتے تھے۔

حدیث معاذؓ بن جبلؓ والی روایت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجتہاد کی اجازت اس وقت دی جب انہیں انتظامی اور عدالتی ذمہ داریاں سونپی تھیں بالفاظ دیگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ بن جبلؓ کو اجتہاد کی اجازت بحیثیت عامل 'گورنر یا قاضی دی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص انتظامی اور تنفیذی امور کا ذمہ دار ہوتا ہے وہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے اور ہر زاویہ سے اسے پرکھنے کی کوشش کرتا ہے' خاص طور پر تطبیقی اور تنفیذی امور کا خیال رکھتا ہے۔ اس کی رائے محض تصوراتی نہیں ہوتی بلکہ وہ خود زیر غور مسئلہ کے سیاق و سباق اور ظروف و احوال سے واقف ہوتا ہے' ایسا فرد قابل عمل اور قابل تنفیذ حل پیش کر سکتا ہے۔ شائد اسی وجہ سے متقدمین فقہاء کا ایک طبقہ اس بات کا قائل رہا ہے کہ اجتہاد کا حق صرف ان لوگوں کو حاصل ہے جو عدالتی یا تنفیذی اختیارات رکھتے ہوں (۴)

اجتہاد کا یہ پہلو غالباً امام شافعیؒ کے پیش نظر بھی رہا ہے' اسی وجہ سے وہ اجتہاد کے اثبات کیلئے حدیث معاذ کو پیش نہیں کرتے بلکہ الرسالہ میں اجتہاد پر گفتگو کرتے ہوئے وہ قرآن حکیم کی اس آیت مبارکہ سے استدلال کرتے ہیں:

"ومن حیث خرجت فول وجھک شطر المسجد الحرام ' وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ" (البقرہ ۲:۱۵۰)

اور تم جہاں سے بھی نکلو (نماز میں) اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو اور تم جس جگہ بھی ہو اپنا رخ اسی مسجد کی طرف کیا کرو۔

حالت سفر میں جب کوئی فرد کسی ایسے مقام پر ہو جہاں جہت قبلہ جاننا مشکل ہو تو ایسی حالت میں نمازی کو چاہیئے کہ وہ غور و فکر کرے ' عقل و رائے سے کام لے اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ علامات کو دیکھ کر صحیح جہت قبلہ معلوم کرنے کی کوشش کرے' مثلاً چاند و سورج کی حرکت یا ستاروں کی گردش کو دیکھ کر کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرے پھر ان علامات فطرت اور اپنی عقل و فہم کے ذریعہ جس نتیجہ پر پہنچے اس پر عمل کرے۔ اور اس جانب منہ کر کے نماز پڑھ لے جس جہت کا تعین اس نے غور و فکر کے بعد کیا ہے۔ (۵)

اجتہاد کے ثبوت کیلئے یہ بہت عمدہ استدلال ہے ۔ اس بحث سے اجتہاد کا جو مفہوم ابھرتا ہے اس میں بہت وسعت ہے۔ وہی وسعت جو احناف و مالکیہ کے تصور اجتہاد میں ہے یا جو اجتہاد بالرائی عہد صحابہ میں متداول تھا' اس اجتہاد کو صرف قیاس میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔

اجتہاد سے متعلق دوسری حدیث جسے صحاح ستہ کے تمام محدثین نے روایت کیا ہے حضرت عمرو بن العاص کی مشہور روایت ہے:

"اذا حکم الحاکم فاجتھد فاصاب فلہ اجران' واذا حکم فاجتھد فاخطا فلہ اجر" (٦)

"جب کوئی حاکم فیصلہ کرتا ہے اور فیصلہ سے قبل مسئلہ زیر غور میں اجتہاد کرتا ہے اور صحیح نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے تو اسے دگنا اجر ملتا ہے۔ اور اگر اس سے اجتہادی فیصلہ میں غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو بھی اسے ایک اجر ضرور ملتا ہے"۔

محدثین اس روایت کو دونوں طرح نقل کرتے ہیں " اذا حکم الحاکم- بھی اور " اذا قضی القاضی " بھی امام بخاریؒ جو ایک عظیم محدث کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں لیکن ان کی تصنیف الجامع الصحیح کے تراجم ابواب سے فقہ اور اصول میں ان کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے طرز استدلال کا پتہ چلتا ہے۔ امام بخاریؒ نے مختلف ابواب میں تینوں اصطلاحات استعمال کی ہیں، قاضی، حاکم اور عامل۔ ان روایات کو وہ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ میں ذکر کرتے ہیں۔ اس سے امام بخاری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ میں وہ لوگ جو انتظامی، عدالتی اور تنفیذی اختیارات رکھتے ہوں انھیں اجتہاد کرنا چاہئے (بشرطیکہ وہ اجتہاد کی اہلیت و صلاحیت رکھتے ہوں) اپنی اس اجتہادی کاوش پر وہ عنداللہ ماجور ہوں گے۔

اجتہاد کا یہ پہلو کہ اس کے اجراء کا عمل اہل حل و عقد کیلئے ضروری ہے امام بخاری اس کا اظہار ایک باب میں اس طرح کرتے ہیں کہ وہ قضاۃ کے اجتہاد اور خلفاء کا ماہرین تجربہ کار اور اہل علم سے امور مملکت میں مشورہ کو ایک ساتھ ایک باب میں بیان کرتے ہیں۔ گویا امام بخاریؒ کے نزدیک خلفاء کا تجربہ کار ماہرین اور اہل علم سے مشورہ کرنا اور پھر ان کی آراء کی روشنی میں کسی نتیجہ تک پہنچنا سب سلسلہ اجتہاد کی کڑیاں ہیں۔ (۷)

اجتہاد کے بارے میں مشہور یہی دو حدیثیں ہیں اور ان دونوں میں اولو الامر کو اجتہاد کا حق دیا گیا ہے۔ البتہ فقہاء اجتہاد کے ثبوت میں بعض قرآنی آیات بھی پیش کرتے ہیں ان آیات سے جو اجتہاد ثابت ہوتا ہے وہ صرف اہل حل و عقد تک محدود نہیں رہتا بلکہ علماء کو بھی اس کی اجازت ہے، مثلاً امام شافعیؒ کا سورہ بقرہ کی آیات سے استدلال جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یا مثلاً -فاعتبروا یا اولی الابصار- (الحشر ۵۹:۲)

"پس عبرت حاصل کرو اے (بصیرت کی) نگاہیں رکھنے والو"

فقہاء کے نزدیک اعتبار کا مطلب یہ ہے کہ مسائل و احکام اور فیصلوں میں نظائر و امثال کو پیش نظر رکھا جائے اور ان کی روشنی میں نتائج اخذ کئے جائیں (۸)

سورہ حشر کی اس آیت مبارکہ کو اس کے سیاق و سباق میں دیکھیں تو اس میں یہودیوں کی عہد شکنی کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے نتیجہ میں جو ان کا حشر ہوا اسکی وضاحت کی گئی ہے پھر اہل

بصیرت کو کہا گیا کہ وہ ان واقعات سے سبق حاصل کریں۔ بدعہدی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر آئندہ کسی قوم نے اس طرح کی حرکت کی تو اسے بھی اسی قسم کے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

یہ آیات مبارکہ مطلق ہیں' ان سے جو اجتہاد ثابت ہوتا ہے اسکی اجازت ان تمام افراد کو حاصل ہے جو اجتہاد کی اہلیت و صلاحیت رکھتے ہوں اس میں قضاۃ و حکام کی تخصیص نہیں۔

اجتہاد کے ثبوت میں قرآن حکیم کی مذکورہ بالا دونوں آیات بہت اہم ہیں۔ ان سے جو اجتہاد ثابت ہوتا ہے وہ اپنے وسیع مفہوم کے ساتھ ہی ثابت ہوتا ہے جس میں عقل و رائے کو بھی ایک حیثیت حاصل ہے۔ آثار و علامات کو سمجھ کر قبلہ کی سمت معلوم کرنا ہو یا قوموں کے عروج و زوال کے واقعات جان کر ان سے نتائج اخذ کرنا' ہر دو صورتوں میں عقل و رائے کا استعمال ناگزیر ہے۔

اجتہاد کا مشاورتی اسلوب

عہد نبوی ؐ اور عہد صحابہ میں اجتہاد کے سلسلہ میں مختلف اسالیب استعمال ہوتے رہے ہیں' ان میں سب سے اہم اور نمایاں اسلوب مشاورتی اجتہاد ہے۔ جنگی منصوبہ بندی' انتظامی معاملات' تدبیر مملکت اور اجتماعی امور میں خاص طور پر مشاورتی اجتہاد کا کثرت سے اجرا ہوا ہے۔ مثلاً جنگ بدر میں مسلم مجاہدین کیلئے جنگی نقطہ نگاہ سے مناسب جگہ کا تعین' یا غزوہ احد میں اس بات کا فیصلہ کہ مدینہ منورہ کا دفاع شہر کے اندر رہ کر کیا جائے یا باہر نکل کر کیا جائے باہمی مشورہ سے طے پایا تھا۔ اسی طرح جنگ احزاب میں جب مدینہ منورہ کا محاصرہ شدت اختیار کر گیا اور اہل مدینہ پر بہت سخت وقت تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب افواج کا زور توڑنے کیلئے ارادہ فرمایا کہ قبیلہ غطفان کے لوگوں کو اس بات پر راضی کر لیا جائے کہ وہ عربوں کی مشترکہ فوجی کاروائی سے الگ ہو جائیں اور اس کے عوض انھیں مدینہ منورہ کی کھجور کی پیداوار سے ایک تہائی حصہ دیدیا جائے۔ اس فارمولے پر مصالحت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے نمایاں لیڈروں حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ سے مشورہ فرمایا۔ ان حضرات کے حوصلے ابھی بلند تھے' ان کی رائے میں ایک تہائی پیداوار پر مصالحت کا ابھی وقت

نہیں تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور غطفان سے مصالحت کا ارادہ ترک فرما دیا (۹)۔

صلح کا یہ معاہدہ اگر طے پا جاتا تو اس کے سیاسی و معاشرتی لحاظ سے دور رس نتائج بر آمد ہوتے۔ مدینہ منورہ کی ایک بڑی آبادی اس سے متاثر ہوتی' لہٰذا رسول اللہ ؐ نے اس معاملہ میں اہل مدینہ کی قیادت سے مشورہ کے بعد فیصلہ فرمایا۔ آپ کا یہ فیصلہ مشاورتی اجتہاد کا نتیجہ تھا۔

مشاورتی اجتہاد کی عہد رسالت میں ایک اور اہم اور قابل غور مثال قبیلہ ہوازن کے جنگی قیدیوں کی رہائی ہے۔ سن آٹھ ہجری میں غزوہ حنین میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی تو بہت سے لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں جنگی قیدی بنے۔ اختتام جنگ کے بعد جب حالات معمول پر آئے تو قبیلہ ہوازن کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے لوگوں کی رہائی کی درخواست پیش کی۔ ان جنگی قیدیوں کا مسئلہ مشکل بھی تھا اور پیچیدہ بھی۔ ان قیدیوں کو اگر مدینہ منورہ میں رکھا جاتا تو اس کے یقیناً کچھ نفسیاتی اور سیاسی اثرات ہوتے اور اگر رہا کر دیا جاتا تو اس کے بھی نفسیاتی اور سیاسی اثرات ہوتے لیکن اس دوسری صورت میں اثرات پہلی صورت سے بالکل مختلف ہوتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے یہ تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور انہیں بغیر کسی معاوضہ کے رہا کر دیا جائے' لیکن آپ ؐ نے اپنی رائے کے مطابق از خود فیصلہ نہیں فرما دیا بلکہ نماز ظہر کے بعد عامتہ المسلمین کے سامنے اس مسئلہ کو رکھا اور ان کی رائے لی۔ عام طور پر صحابہ کرام ؓ اسی رائے کے حامی تھے جو رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی مگر بعض افراد جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور ابھی اسلام کی اصل روح سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے تھے انہیں اس میں تردد ہوا کہ دشمن کے ان قیدیوں کو جنہوں نے نہ صرف یہ کہ جنگ میں مسلمانوں کے خلاف شرکت کی بلکہ انہیں جانی و مالی نقصان بھی پہنچایا تھا بغیر کسی معاوضہ کے رہا کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ محسوس فرمایا کہ کچھ لوگ مخمصہ کا شکار ہیں اور کسی متفقہ فیصلہ پر نہیں پہنچ پا رہے ہیں تو آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ اپنے نمائندوں کو بھیجیں تاکہ ان سے اس مسئلہ پر گفتگو کی جا سکے۔ لوگ اس بات پر تیار ہو گئے اور انہوں نے اپنے قائدین (عرفاء) کو مشورہ کیلئے آپ کی خدمت میں بھیج دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور لوگوں کے قائدین نے اس مسئلہ

پر غور و فکر کیا اور باہمی مشورہ سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام جنگی قیدیوں کو فوری طور پر بغیر کسی معاوضہ کے رہا کر دیا جائے مشاورتی مجلس کے اختتام پر آپ نے تقریباً چھ سو قیدیوں کو رہا کر دیا (۱۰)۔

دور صحابہ میں شورائی اجتہاد کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں لیکن سب سے اہم اور مشکل مسئلہ جو مشاورتی اجتہاد کے ذریعہ حل کیا گیا وہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ رسول اللہ ؐ کے وصال کے بعد خلیفہ کا انتخاب محض ایک سیاسی یا انتظامی معاملہ نہ تھا بلکہ ایک بنیادی فقہی مسئلہ بھی تھا۔ آپ ؐ کی رحلت کے بعد صحابہ کرام نے اس موضوع پر انفرادی طور پر بھی غور و فکر کیا اور اجتماعی طور بھی۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں اس موضوع پر بحث و گفتگو ہوئی' مختلف زاویوں سے متعدد پہلوؤں پر غور و فکر کیا گیا۔ اس مشاورتی مجلس کے چند پہلو ہمارے نقطہ نگاہ سے اہم ہیں۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے اس مجلس سے مشاورتی اجتہاد کی ایک دستوری حیثیت قائم ہوئی۔ دوسرے یہ کہ اس مشاورت میں اجتہاد کے بعض اسالیب بھی سامنے آئے ہیں مثلاً یہ کہ تعین خلیفہ کے فیصلہ میں اس دور کی امت مسلمہ کی سیاسی و اجتماعی مصلحتوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا۔ اجتہاد کا ایک اسلوب حضرت عمرؓ کے طریق استدلال میں نظر آتا ہے' حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ ابوبکر وہ فرد ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں امت کا امام مقرر فرما دیا تھا (جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ ابوبکرؓ سے بوقت رحلت خوش تھے بلکہ ان کی دینی قیادت پر بھی مکمل اعتماد تھا لہٰذا ہمیں اپنے اجتماعی اور انتظامی امور میں بھی ان کی قیادت پر اعتماد کرنا چاہئے' بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جسے رسول اللہ ؐ مقرر فرما دیں اسے دوسرے لوگ ہٹا دیں! اس استدلال میں عقل و ذہانت پوری طرح کار فرما نظر آتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے انتظامی اور سیاسی امور میں قیادت کو دینی امور میں قیادت پر قیاس کرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کی تائید کی جسے سقیفہ بنو ساعدہ میں موجود تقریباً سب ہی لوگوں نے قبول کیا۔ اس اجتماعی اور مشاورتی اجتہاد نے ہی حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی راہ ہموار کی (۱۱)۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے آخری دور میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کے معاملہ میں ہر پہلو سے غور و فکر کیا خاص طور پر اس پہلو سے کہ ان کے بعد امت مسلمہ کی قیادت کرنے اور

خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کیلئے کون سب سے زیادہ موزوں و مناسب ہوگا' اور یہ کہ عامتہ المسلمین کس کی قیادت کو قبول کر لیں گے' حضرت ابوبکرؓ کی رائے میں حضرت عمرؓ سب سے زیادہ مناسب اور باصلاحیت فرد تھے۔ یہ حضرت ابوبکرؓ کا انفرادی اجتہاد تھا۔ دوسرے مرحلہ پر حضرت ابوبکرؓ نے اس موضوع پر بعض نمایاں لوگوں سے مشورے کئے۔ سب سے پہلے ان افراد سے مشورہ کیا جو خود بھی خلافت کی صلاحیت رکھتے تھے اور ان کی قائدانہ حیثیت مسلم تھی مثلاً حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت عثمانؓ ۔ حضرت عثمانؓ نے تو پوری طرح حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق کیا' حضرت عبدالرحمن بن عوف بھی حضرت عمرؓ کی قائدانہ صلاحیتوں کے معترف تھے۔ لیکن انہوں نے اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ حضرت عمرؓ کے مزاج میں سختی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی یہ سختی امت مسلمہ کیلئے تنگی کا سبب بنے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جو حضرت عمر کے مزاج اور ان کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے اس سوال کا جواب یہ دیا کہ فی الوقت تو عمر کی سختی ایک توازن پیدا کرتی ہے اس لئے کہ میرے مزاج میں بہت نرمی ہے' البتہ جب تمام تر ذمہ داری حضرت عمرؓ پر آرہے گی تو ان میں یہ شدت نہیں رہے گی۔ عبدالرحمن بن عوفؓ اس جواب پر مطمئن ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مشورہ کا دائرہ وسیع کر دیا اور حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ' حضرت اسید بن حضیر اور بعض دیگر حضرات سے بھی رائے لی۔ سب ہی حضرت عمرؓ کی صلاحیتوں اور قابلیت کے معترف تھے۔ البتہ حضرت طلحہؓ نے بھی اس خدشہ کا اظہار کیا جس کا اظہار حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کر چکے تھے۔ انہیں بھی حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے مزاج کا تجزیہ کر کے یہی کہا کہ میری خلافت میں ان کی شدت کی ضرورت ہے تاکہ اعتدال اور توازن قائم رہے' بار خلافت جب ان کے کاندھوں پر آئے گا تو پھر ان میں یہ سختی اور شدت باقی نہیں رہے گی۔

حضرت ابوبکرؓ چونکہ اس مسئلہ میں اجتہاد کر رہے تھے لہٰذا وہ ہر پہلو کو پوری دیانت داری اور ذمہ داری کے ساتھ پرکھ رہے تھے' انہوں نے ملت اسلامیہ کی ضروریات' دین کا قیام اور عالمی تناظر میں امت مسلمہ کے کردار کا جائزہ لیا' ساتھ ہی حضرت عمرؓ کی طبیعت اور ان کے مزاج کو بھی پرکھا اور ایک نتیجہ تک پہنچے' اجتہاد چونکہ ایک دینی اصول ہے لہٰذا مجتہد اس کی شرائط کو ملحوظ رکھتا ہے اور اپنے اس سارے عمل میں پوری دیانت داری اور اخلاص سے کام لیتا ہے' یہی

وجہ ہے کہ اسے لوگوں کو آمادہ کرنے میں مشکلات پیش نہیں آتیں۔

اس مشاورتی مرحلہ میں جب حضرت ابوبکرؓ نے قائدین امت کو مطمئن پایا تو ایک تحریر لوگوں کے نام لکھدی جس میں حضرت عمر کو خلافت کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ یہ تحریر شورائی اجتہاد کے نتیجہ میں لکھی گئی تھی۔ یہ تحریر مسجد میں عام لوگوں کے سامنے پڑھی گئی۔ مسجد میں موجود تمام افراد نے اس رائے سے اتفاق کیا اور حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں اپنا دوسرا خلیفہ منتخب کر لیا (۱۲)

حضرت عمرؓ کے اختیار (۱۳) کے بہت سے مراحل نظر آتے ہیں' ان میں سے ہر مرحلہ میں اجتہاد کی کوئی نہ کوئی صورت پائی جاتی ہے۔ ابتدائی مرحلہ میں انفرادی اجتہاد ہوا جس میں حضرت ابوبکرؓ نے امت مسلمہ کے مجموعی مفاد اور قیام دین کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھا۔ خود ابوبکر کے الفاظ یہ ہیں "اللہ تعالی کی قسم میں نے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کیلئے اجتہاد کیا اور حتی المقدور کوشش کی کہ صحیح نتیجہ تک پہنچوں" (۱۴)

دوسرے اور تیسرے مرحلے میں شورائی یا اجتماعی اجتہاد عمل میں آیا اور اس کے نتیجہ میں حضرت عمر کی قیادت پر اعتماد کیا گیا۔

اختیار خلیفہ کیلئے اجتہاد کا عمل حضرت عمرؓ نے بھی اپنے آخری ایام میں شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے بہت غور و فکر کے بعد ایک کمیٹی تشکیل دیدی تھی جو تاریخ میں شوریٰ ہی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کمیٹی سات افراد پر مشتمل تھی: حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ' حضرت عثمانؓ ' حضرت علیؓ ' حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ' حضرت طلحہؓ اور حضرت الزبیرؓ اس کے ممبر تھے۔ ساتویں ممبر عبداللہ بن عمرؓ تھے جو صرف مشورہ میں شریک رہنے اور شوریٰ کو منظم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ اس مجلس کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اول الذکر چھ ممبران میں سے کسی ایک کو باہمی مشورہ سے خلیفہ مقرر کر لے۔ اس شورائی کمیٹی نے مشورہ کا دائرہ اپنے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں عام لوگوں کو بھی شامل کر لیا۔ آخر میں جب صرف دو امیدوار رہ گئے تو ان دونوں کے بارے میں مدینہ منورہ میں عام لوگوں سے رائے لی گئی۔ بعض لوگوں کو کمیٹی نے مدینہ سے باہر جانے والی شاہراہوں پر مقرر کر دیا تاکہ وہ مدینہ منورہ آنے والے اور مدینہ سے باہر

جانے والے افراد اور قافلوں سے بھی رائے معلوم کریں' حتی کہ خواتین کو بھی مشورہ میں شریک کر لیا گیا' اس طرح مشورہ کا دائرہ اس اختیار میں بہت وسیع ہو گیا تھا (۱۵)

چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کا اختیار بہت ہنگامی حالات میں عمل میں آیا تھا۔ حضرت عثمانؓ باغیوں کے ہاتھوں شہید ہو چکے تھے' بظاہر کوئی ایسی واحد شخصیت نمایاں نہ تھی جو تمام صورت حال کو کنٹرول کر سکتی اور امت مسلمہ کو بھی متحد رکھ سکتی۔ حضرت علیؓ کی شخصیت البتہ ایسی تھی جس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھتی تھیں وہ یقیناً امت مسلمہ کی رہنمائی فرما سکتے تھے' لیکن حضرت علیؓ کے اختیار کے عمل میں جو خلا پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اس وقت کوئی خلیفہ موجود نہیں تھا جو اپنی اجتہادی رائے پیش کرتا یا اجتماعی اجتہاد کو اس مسئلہ کیلئے منظم کرتا۔ بہرحال اس ہنگامی صورت حال سے نکلنے کیلئے صحابہ کرام کے ایک طبقہ نے از خود غور و فکر کیا' ان کی رائے میں حضرت علیؓ خلافت کیلئے سب سے زیادہ مناسب فرد تھے' یہ لوگ حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ حضرت علیؓ نے شروع میں انکار کیا لیکن صحابہ کرام کے مختلف طبقات ان سے ملتے رہے اور انہیں اس ذمہ داری پر آمادہ کرتے رہے اس دوران حضرت علیؓ کو بھی موقعہ ملا کہ وہ بھی اس معاملہ پر غور و فکر کریں اور اپنی رائے و اجتہاد کی روشنی میں کسی فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ جب ان لوگوں کا اصرار بہت بڑھ گیا جو حضرت علیؓ کو خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے پر آمادہ کر رہے تھے تو حضرت علیؓ نے انھیں صاف صاف بتا دیا کہ خلافت کا معاملہ گھر پر یا کسی خفیہ مقام پر حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلہ میں عام لوگوں کی رائے بھی شامل ہونی چاہئے' خاص طور پر اہل مدینہ کی رائے اور مشورہ بہت ضروری ہے۔ حضرت علیؓ کے مشورہ سے ان سب لوگوں کا مسجد میں اجتماع ہوا جہاں باہمی مشورہ سے حضرت علیؓ کا اختیار عمل میں آیا' اس اجتماع میں انصار و مہاجرین کی اچھی خاصی تعداد شریک تھی جنھوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی (۱۶)

شورائی اجتہاد کی یہ چند مثالیں ہیں جن کا امت مسلمہ کی اجتماعی اور دستوری زندگی کے اہم پہلوؤں سے گہرا تعلق ہے اور جو مستقبل کے اجتماعی معاملات کیلئے بھی رہنما اصول فراہم کرتی ہیں۔ سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے اہل علم و دانش اور ارباب حل و عقد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ امت کے اجتماعی امور میں پوری دیانت داری اور اخلاص کے ساتھ غور و

وفکر کرتے رہا کریں، باہم ایک دوسرے سے مشورے کیا کریں، اور اپنے غوروفکر اور باہمی مشوروں کے نتائج سے عام لوگوں کو بھی آگاہ کرتے رہا کریں۔ ان دانشوروں کی بلند و مثبت فکر، ان کا تعمیری اور تخلیقی انداز گفتگو اور ذہانت و دانائی پر مبنی قوت استدلال عام لوگوں کی، خاص طور پر نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بھی ہو گا اور لوگوں کے فکری رجحانات کی صحیح جہت میں رہنمائی کا سبب بھی بنے گا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ اصول بھی نمایاں ہوتا ہے کہ اجتماعی امور میں شورائی اجتہاد کو بنیاد بنانا چاہئے۔ خود اجتہاد بہت سی لغزشوں اور خامیوں سے محفوظ کرتا ہے پھر شورائی اجتہاد لغزشوں کے امکانات کو مزید کم کر دیتا ہے۔

ایک اور اصولی بات بھی مذکورہ مثالوں سے واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ شوریٰ کا طریق کار حالات اور ضروریات کے مطابق تبدیل ہو سکتا ہے، جیسا کہ خلفاء راشدین کے اختیار میں ہمیں نظر آتا ہے کہ اجتماعی اجتہاد تو سب کے اختیار میں مشترک رہا ہے لیکن اس کا طریق کار اور اسلوب احوال و ظروف کے لحاظ سے مختلف رہا ہے۔

اجماع

فقہ اسلامی میں اجماع کی حجیت مسلم ہے اور وہ دلیل کے طور پر جمہور فقہاء کے نزدیک قبول کیا جاتا ہے، لیکن کسی بھی مسئلہ پر اجماع کا انعقاد وقت اور محنت طلب ہوتا ہے۔ آغاز میں ایک مسئلہ اجتہادی مراحل سے گذرتا ہے پھر بہت سے مراحل طے کر کے اجماع کے مرحلہ میں داخل ہوتا ہے اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجماع اجتہاد کی سب سے قوی صورت ہوتی ہے جس پر تمام مجتہدین متفق ہوتے ہیں۔ (☆)

عہد خلافت راشدہ کے آغاز میں صحابہ کرامؓ نے ایک ایسے اصول کی شدت سے ضرورت محسوس کی جو نہ صرف یہ کہ امت کو دین کی بنیادی باتوں پر متحد رکھ سکے بلکہ اہم اجتماعی امور پر اتفاق و یکجہتی بھی پیدا کر سکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے سب سے پہلے صحابہ کرامؓ

☆ مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے میں مصادر تشریع تین ہیں، قرآن، سنت اور اجتہاد اجماع کو وہ اجتہاد ہی کی ایک قوی صورت مانتے ہیں۔ دیکھئے اصلاحی: Islamic Law: Concept and Condification (اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۷۹ء) ص ۲۷-۲۸

نے اجماع کی قوت کو محسوس کیا اور اسے ایک اصول اور حجت کے طور پر استعمال کیا۔ بعد میں فقہاء نے صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفاء راشدینؓ کے نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے نظریہ اجماع کو فنی اعتبار سے پیش کیا۔ فقہاء کے پیش نظر بھی یہی مقاصد تھے کہ دین کے مسلمہ اصولوں اور بنیادی باتوں پر مکمل اتفاق رہے، امت مسلمہ کی وحدت و سالمیت کا تحفظ کیا جائے، ملت اسلامیہ کے اجتماعی معاملات میں حتی الامکان اتحاد و اتفاق پیدا ہو اور ایسے اختلاف کو روکا جاسکے جو تفرقہ یا باہمی جھگڑوں کا سبب بنے۔ اس سلسلہ میں فقہاء نے ان آیات مبارکہ سے استدلال کیا ہے جن میں امت کی وحدت کو ایک دینی ضرورت قرار دیا گیا ہے یا تفرقہ پیدا کرنے والے اختلاف سے منع کیا گیا ہے مثلاً:

"ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ" (الشوریٰ ۴۲ : ۱۳)

دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو،

"واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا" (آل عمران ۳ : ۱۰۳)

"اور سب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا اور گروہ بندی نہ کرنا"

"ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون" (الانبیاء ۲۱ : ۹۲)

"یقیناً یہ آپکی امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس صرف میری عبادت کرو

ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ و انا ربکم فاتقون (المومنون ۲۳ : ۵۲)

"یہ آپ کی امت یقیناً ایک امت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں لہٰذا تقویٰ میرا ہی اختیار کرو"

"ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نو لہ ما تولی ونصلہ جھنم" (النساء ۴ : ۱۱۵)

"اور جو شخص اللہ کے رسول کی مخالفت کرے اور اہل ایمان کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے اختیار کرنے لگے تو ہم اس کو اسی طرف لے جائیں گے جس طرف جانے کا اس نے انتخاب کرلیا ہے اور اسے جہنم میں پہنچادیں گے"

"وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ، ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ"

(الانعام ۶ : ۱۵۳)

"اور یہ میرا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے پس تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں کو اختیار نہ کرو کیونکہ وہ تمہیں اللہ تعالٰی کے راستہ سے ہٹادیں گے"

اختلاف فی نفسہ کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے ۔ البتہ اگر مثبت انداز میں تعمیری مقاصد کیلئے علمی بنیاد پر اخلاص و دیانت داری کے ساتھ کوئی رائے پیش کی جائے تو وہ پسندیدہ امر ہے۔ قرآن حکیم نے اہل کتاب کے اس اختلاف کو رد کیا ہے جس کی بنیاد سرکشی اور نفرت تھی:

"وما اختلف فیہ الا الذین اوتوہ من بعد ماجاء تھم البینات بغیا بینھم" (البقرہ ۲ : ۲۱۳)

"اور اختلاف نہ کیا اللہ تعالٰی کی اس کتاب میں مگر انہی لوگوں نے جو اہل کتاب تھے حالانکہ ان کے پاس واضح دلائل آچکے تھے۔ یہ اختلاف انہوں نے محض آپس کی ضد اور سرکشی کی وجہ سے کیا"۔

اس آیت مبارکہ کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ امت کی وحدت کو اسی قسم کے اختلاف نے پارہ پارہ کیا۔ ایک اور آیت میں بھی اختلاف میں فساد کی بنیاد بغی کو بیان کیا گیا ہے:

"وما اختلف الذین اوتوا الکتب الا من بعد ما جاء ھم العلم بغیا بینھم (آل عمران ۳ : ۱۹)

" اور اہل کتاب نے علم ہونے کے باوجود محض ضد اور سرکشی کی بنا پر اختلاف کیا"

علم اور صحیح دلیل کو نظر انداز کرنا بھی تفرقہ کا سبب بنتا ہے سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۳ اور آل عمران کی آیہ ۱۹ جو اوپر ذکر کی گئی ہیں ان میں علم سے انحراف باہمی اختلاف کا سبب معلوم ہوتا ہے۔ سورۃ البینہ میں واضح دلیل کو رد کرنا بطور سبب ذکر ہوا ہے:

"وما تفرق الذين اوتوا الكتاب الا من بعد ما جاء تهم البينہ" (البینہ ۹۸ : ۴)

"اور اہل کتاب میں جو پھوٹ پڑی ہے وہ واضح دلیل آنے کے بعد پڑی"

اس لئے کہ انہوں نے دلیل کو قبول نہیں کیا تھا۔ حالانکہ علم اور دلیل کو تسلیم کرنا چاہئے۔ قرآن کریم علم ودلیل کو موثر انداز میں پیش کرتا ہے اور اسے قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ علم و دلیل کی قوت ہی اجماع کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اجماع سے متعلق "عصمہ" کا تصور بھی بہت اہم ہے ۔ ہمارے بعض فقہاء نے اس موضوع پر مبسوط بحث کی ہے۔ فقہاء یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ جس مسئلہ پر امت مسلمہ کا اجماع ہو جاتا ہے اس میں خطا یا غلطی کا امکان نہیں رہتا' بالفاظ دیگر امت کا متفقہ فیصلہ شرعاً گمراہی یا خطا سے پاک ہوتا ہے' لہٰذا امت مسلمہ اس کے علماء' فقہاء اور ارباب حل و عقد کو چاہئے کہ وہ اس نظریہ کی اہمیت کو محسوس کریں اور امت کے اجتماعی معاملات میں خاص طور پر یہ کوشش کریں کہ وہ مکمل اتفاق رائے سے طے پائیں' اس سے نہ صرف یہ کہ ہماری وحدت کو استحکام حاصل ہو گا بلکہ اس مخصوص مسئلہ میں عصمہ کی سعادت بھی حاصل ہو گی۔

اجماع کی صورت میں عصمت کا تصور قرآن حکیم کی ان آیات سے مستنبط ہوتا ہے جن میں امت مسلمہ کو امت وسط' یا خیر امہ وغیرہ کے الفاظ سے خطاب کرکے اس کی مدح و توصیف کی گئی ہے' مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت:

"وكذالک جعلنكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا (البقرہ ۲ : ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تمہیں امت وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر گواہ رہیں"۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کی عدالت کی گواہی دی ہے جسکی بنا پر وہ شہادت کا فریضہ انجام دینے کی اہل قرار پائی ہے' یہ فضیلت امت مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ پھر صفت عدالت ہی کی وجہ سے اسے "خیر امتہ" بھی کہا گیا ہے' اس لئے کہ یہ امت اجتماعی

طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کے ساتھ جب یہ امت معروف کے قیام اور منکر کی روک تھام کیلئے اجتماعی طور پر جدوجہد کرتی ہے اور اس سلسلہ میں اجتماعی فیصلے کرتی ہے یا معاشرتی نظم و نسق کو بہتر بنانے کیلئے یا اسلامی اقدار کے تحفظ کیلئے کچھ قاعدے اور ضابطے طے کرتی ہے تو اس جدوجہد اور عمل میں کوشش یہی ہونی چاہئے کہ اجماع قائم ہو جائے۔

عصمت کا تصور قرآن کریم کی بہ نسبت احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ امام ابن ماجہؒ، امام ترمذیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ روایت کرتے ہیں:

"لا تجتمع امتی علی ضلالۃ" (۱۷)

میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہوگی

ایک دوسری روایت میں "علی خطاء" کے الفاظ ہیں۔ یہ روایت اگرچہ خبر واحد ہے لیکن محدثین کے نزدیک متواتر بالمعنی کہلاتی ہے، اس لئے کہ اس مفہوم کو ادا کرنے والی بہت سی روایات ہیں۔ تقریباً تمام مکاتب کے فقہاء اس حدیث کو تصور عصمت کے ثبوت میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں (۱۸)

"لا تجتمع امتی علی ضلالۃ" ایک طویل حدیث کا حصہ ہے۔ اگرچہ فقہاء کے نزدیک صرف یہ حصہ ثبوت عصمت کیلئے کافی ہے لیکن حدیث کے باقی حصے بھی اجماع سے متعلق معلوم ہوتے ہیں اور اس بحث میں قابل غور ہیں، مثلاً امام ترمذیؒ نے یہ حدیث اس طرح نقل کی ہے۔

"اللہ تعالیٰ میری امت یا امت محمدؐ کو گمراہی پر متفق نہیں ہونے دے گا، اور اللہ تعالیٰ کی مدد (ید اللہ) جماعت کو حاصل ہوتی ہے لہذا جو جماعت سے علیحدہ ہو گا وہ جہنم میں جائے گا" (۱۹)

ابن ماجہ نے ابو خلف سے اس طرح روایت کیا ہے:

"میری امت کبھی بھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی، جب تم باہمی اختلافات دیکھو تو سواد اعظم

کی اتباع کرو" (۴۰)

امام احمد بن حنبلؒ حضرت ابو ذرؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں:

"دو افراد (ایک ساتھ) بہتر ہیں اکیلے فرد سے، تین افراد اکٹھے بہتر ہیں دو سے اور چار بہتر ہیں تین سے لہٰذا تم مضبوطی کے ساتھ جماعت سے وابستہ رہو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ متحد جماعت کو ہمیشہ ٹھیک راستہ پر رکھتا ہے"

ان روایات اور ان کے ہم معنی بہت سی دوسری روایات نہ صرف یہ کہ وسیع تر اتحاد و اتفاق کی اہمیت کو واضح کر رہی ہیں بلکہ مکمل اتفاق کی صورت میں گمراہی و خطا سے حفاظت کی ضمانت بھی مہیا کر رہی ہیں۔

ان روایات میں واضح پہلو تو امت کی عصمت کا ہے جو اجماع کی صورت میں اسے حاصل ہے لیکن انہی روایات میں اس بات کی طرف بھی لطیف پیرایہ میں اشارہ ملتا ہے کہ امت مسلمہ کو اپنے اجتماعی اور بنیادی امور میں ضرور اجماع کی طرف قدم بڑھانا چاہئے، اس لئے کہ اجماع مطلوب ہے، مستحسن ہے، اسکی وجہ سے بہت سی خرابیوں سے تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔

ایک اور اہم پہلو جو ان احادیث سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں مکمل اجماع کی صورت ممکن نہ ہو یا اس کے قیام میں مشکلات ہو تو واضح اکثریت بھی حجت کا درجہ رکھتی ہے بغیر کسی معقول وجہ کے اس کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے بعض فقہاء نے اسے بھی اجماع قرار دیا ہے۔ بعض فقہاء نے اگرچہ فنی لحاظ سے اسے اجماع تسلیم نہیں کیا لیکن واضح اکثریت کے اتفاق کو دلیل اور حجت ضرور تسلیم کیا ہے (۴۱)

خلافت راشدہ کے دور میں اجماع کا استعمال زیادہ تر اجتماعی و معاشرتی امور میں ہوتا رہا ہے گو ان معاملات کی فقہی حیثیت بھی تھی۔ بعد میں فقہاء نے اسے محض فقہی مسائل تک محدود رکھا۔ انہوں نے اس موضوع پر فنی لحاظ سے اسقدر دقیق بحثیں کی ہیں اور اس کے فقہی پہلو کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ اس کا سیاسی و اجتماعی پہلو پس منظر میں چلا گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پہلا مسئلہ تھا جس پر اجماع کی شعوری کوششیں ہوئیں اور بالآخر

چند ماہ کی مدت میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر اجماع ہو گیا۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ کو دو ذریعوں سے اختیارات حاصل ہوئے' ایک عام لوگوں کی بیعت سے یہ اختیار انہیں جلدی حاصل ہو گیا تھا' دوسرے اجماع سے جو کچھ عرصہ بعد حاصل ہوا۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت سے حضرت عثمانؓ کی خلافت تک اجماع کی کوششیں کامیاب رہیں۔ شوریٰ کے ذریعہ مسئلہ خلافت پر اجماع ہوتا رہا۔ اگر تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کو شہید نہ کیا گیا ہوتا تو چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کی خلافت پر بھی مکمل اجماع ہو جاتا' لیکن شہادت عثمانؓ نے امت مسلمہ کی اجتماعیت اور اجتماعی اداروں کو سخت نقصان پہنچایا اور اجماع جیسے اہم ادارہ کا ارتقاء رک گیا۔ خلافت راشدہ کے بعد حکمرانوں یا سیاسی بصیرت رکھنے والوں نے اجماع کی سیاسی و اجتماعی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھا' انہوں نے اسے ایک ادارے کے طور پر قائم کرنیکی کوشش نہیں کی۔

موجودہ دور کے حالات اور تقاضوں کے لحاظ سے اگر غالب اکثریت کے فیصلہ کو اجماع تسلیم کر لیا جائے تو اس کی بنیاد پر بہت سے امور کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس پہلو پر بہرحال فقہاء کو غور کرنا چاہیئے کہ غالب اکثریت یا سواد اعظم کی رائے کو اجماع تسلیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ فقہاء کا ایک طبقہ اسے اجماع مانتا ہے' امام الطبری اس نقطہ نگاہ کی وکالت کرنے والے فقہاء کے قائد ہیں۔ ابوبکر رازی اور ابو الحسین الخیاط بھی غالب اکثریت کے اتفاق کو اجماع تسلیم کرتے ہیں (۲۲) تھوڑے بہت لوگوں کی مخالفت ان فقہاء کے خیال میں اجماع کی حیثیت کو متاثر نہیں کرتی' ہاں اگر مخالفین کی تعداد "تواتر" کے درجہ کو پہنچ جائے تو پھر بالاتفاق اجماع منعقد نہیں ہو گا۔

مشہور حنبلی فقیہ ابن الفراء بھی اسی نظریہ کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔ مسئلہ خلافت پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ خلفاء راشدین کے اختیارات کا ماخذ و منبع اجماع تھا۔ ابن الفراء حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی خلافت کے جواز اور اس کی دستوری حیثیت کو اجماع کی بنیاد پر ثابت کرتے ہیں۔ پہلے تین خلفاء کے بارے میں تو اجماع ثابت ہے لیکن حضرت علیؓ کی خلافت غالب اکثریت کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی' ایسا لگتا ہے کہ ابن الفراء نے

غالب اکثریت کے فیصلے کو اجماع تسلیم کیا ہے اسی لئے انہوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کے جواز اور اس کی دستوری حیثیت کو اجماع کی بنیاد پر صحیح قرار دیا ہے (۲۳)

مندرجہ بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ شوریٰ اور اجماع ایسے اسالیب اجتہاد ہیں جو نہ صرف یہ کہ ہمارے قانونی معاملات میں رہنمائی کرتے ہیں بلکہ ہماری زندگی کے ہر پہلو اور گوشہ میں پوری طرح رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہمارے فقہاء، علماء اور سیاسی قیادت و بصیرت رکھنے والوں کو چاہیئے کہ ان اداروں کو آج کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے شریعت کے تقاضوں کے مطابق زندگی کے تمام اجتماعی شعبوں میں قائم کرنے کے لئے غور و فکر اور عملی جدوجہد کریں تاکہ ہمارے یہ شرعی ادارے اپنا تعمیری و تخلیقی کردار ادا کرسکیں۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا و ان اللہ لمع المحسنین (العنکبوت ۲۹:۶۹)

حوالہ جات

۱۔ الغزالی، المستصفی -الامیریہ، قاہرہ ۱۳۲۲ھ) ج ۲ ص ۳۵: الآمدی، الاحکام فی اصول الاحکام (المعرفہ، قاہرہ ۱۳۳۲ھ) ج ۲ ص ۲۱۸

۲۔ اس صفت و کردار کو ہمارے فقہاء "عدل" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں عدالت کے جامع مفہوم کیلئے دیکھئے الماوردی، ادب القاضی (مطبعہ الارشاد، بغداد ۱۳۹۱ھ) ج ۱ ص ۶۳۴

۳۔ النسائی، السنن الکبری (دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۱ھ) ج ۳ ص ۴۶۹

۴۔ الغزالی، المستصفی (الامیریہ، بولاق ۱۳۲۲ھ) ج ۲ ص ۳۵۴: الامدی، الاحکام (المعارف، قاہرہ ۱۳۳۲ھ) ج ۴ ص ۲۳۵

۵۔ الشافعی، الرسالہ (تحقیق سید گیلانی، مصطفیٰ البابی الحلبی، قاہرہ ۱۹۶۹) ص ۲۰۵ ـ ۲۱۰

۶۔ البخاری، الجامع الصحیح (دار و مطابع الشعب، تاریخ ندارد) ج ۳ جزء ۹ ص ۱۳۲، ۱۳۳، المسلم، الجامع الصحیح (موسسۃ الطباعہ قاہرہ، ۱۳۸۴ھ) ج ۵ ص ۱۳۱

۷۔ البخاری، الجامع الصحیح (دار و مطابع الشعب، قاہرہ، تاریخ ندارد) باب ۱۳، ج ۳ جزء ۹ ص ۱۲۶

۸۔ الغزالی، المستصفی، ج ۲ ص ۲۵۴: الامدی، الاحکام ج ۳ ص ۲۸۱

۹۔ ابو عبید، کتاب الاموال (مکتبہ کلیات الازہریہ، ۱۴۰۱ھ) ص ۱۵۹

۱۰۔ البخاری، الجامع الصحیح ج ۳ جزء ۹ ص ۸۹: عبدالرزاق، المصنف (المجلس العلمی بیروت ۱۴۰۳ھ) ج ۵، ص ۳۸۱، ۳۸۲: ابن کثیر، البدایہ والنہایہ (المعارف، بیروت ۱۴۰۴ھ) ج ۴ ص ۳۵۴

۱۱۔ الطبری، تاریخ الرسل و الملوک (دارالمعارف، قاہرہ ۱۹۶۱ء) ج ۳ ص ۲۰۲ ۔ ۲۰۶، الجوینی، امام الحرمین، غیاث الامم، (دار الدعوہ، الاسکندریہ ۱۴۰۲ھ) ص ۳۲

۱۲۔ الطبری، تاریخ ج ۳ ص ۲۰۲: ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ (دارالکتاب العربی، بیروت ۱۳۸۷)، ص ۴۹۰

۱۳۔ ہمارے فقہاء نے انتخاب خلیفہ کیلئے "اختیار" کی اصطلاح استعمال کی ہے، اس کا اصل مادہ خیر ہے، اختیار کے تمام مراحل اور سارا عمل در حقیقت خیر کی تلاش یا بہترین فرد کا انتخاب ہے۔

۱۴۔ ابن الاثیر، اسد الغابہ (المکتبہ الاسلامیہ، ۱۲۸۶ھ) ج ۴ ص ۶۹

۱۵۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ (دارالفکر، تاریخ ندارد) ص ۲۱۰، الطبری، تاریخ ج ۴ ص ۲۲۸، ابن الاثیر، الکامل، ج ۳ ص ۶۸، ۶۹، مظہرالحق، A short History of Islam (بک لینڈ، لاہور ۱۹۸۷)، ص ۲۹۹ ۔ ۳۰۰

۱۶۔ الطبری، تاریخ، ج ۴ ص ۲۲۷ تا ۲۳۵: ابن الاثیر، الکامل ج ۳ ص ۱۹۱، ابن خلدون، کتاب العبر ج ۲ ص ۱۰۵۶

۱۷۔ ترمذی، السنن (ح نمبر ۲۲۵۵) ج ۳ ص ۳۱۵: ابن ماجہ، السنن (ح نمبر ۳۹۵۰) ج ۲ ص ۱۳۵۳: احمد بن حنبل، مسند، (دارالمعرفہ، بیروت) ج ۵ ص ۱۳۵

۱۸۔ ابن حزم، الاحکام (مطبع العاصم، قاہرہ ۱۹۶۸ء) ج ۴ ص ۴۹۶: الماوردی، ادب القاضی ج ۱ ص ۴۵۱: الغزالی، المستصفی، ج، ص ۱۷۵: الامدی، الاحکام ج، ص ۳۱۳، ۳۱۴

۱۹۔ ترمذی، السنن حوالہ بالا

۲۰۔ ابن ماجہ، السنن حوالہ سابقہ

۲۱۔ فاروقی، محمد یوسف، اجماع کا ارتقاء: خلفاء راشدین کے فیصلوں اور متقدمین فقہاء کی آراء کی روشنی میں ایک تقابلی جائزہ The American Journal of Islamic Social Sciences ج ۹ شمارہ ۲، ۱۹۹۲ء، ص ۱۸۳، ۱۸۴

۲۲۔ الآمدی، الاحکام، ج ۱ ص ۳۳۶

۲۳۔ ابن الفراء، المعتمد فی اصول الدین (دار المشارق، بیروت ۱۹۷۴ء) ص ۲۲۵